© rasailojaraid.com

ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی

برصغیر کی فارسی کتب تاریخ میں تمدنی و معاشرتی جھلکیاں

برصغیر پاکستان و ہند میں لکھی گئیں اکثر کتب تواریخ کو شاہی روزنامچہ کا نام دیا جا سکتا ہے، اس لیے کہ ان میں زیادہ تر بادشاہوں اور ان کے روزمرہ کے معمولات اور واقعات ہی کو سمیٹا گیا ہے اور عوامی زندگی کی طرف شاید ہی کوئی توجہ دی گئی۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ بیشتر تاریخیں وقت کے بادشاہوں اور سلاطین کے حکم پر لکھی گئیں، اور جو بعض مؤرخین نے آزادانہ طور پر لکھیں انھوں نے بھی وقت کے حکمرانوں سے منسوب کر دیں اور یوں ان کا انداز بھی کچھ ایسا ہی رہا۔ دور سلاطین کی اکثر کتب تاریخ اس زمرے میں آتی ہیں۔ تاہم ان میں تیموری دور کی تواریخ کی طرح حاکم وقت ہی کی ذات مرکز توجہ نہیں ہے بلکہ عوامی زندگی کو بھی ان میں کسی حد تک شامل کیا گیا ہے، ایسی تواریخ میں خاص طور پر قابل ذکر تاریخ فیروز شاہی (از ضیاء الدین برنی) تاریخ فیروز شاہی (از سراج عفیف) اور مشہور فارسی شاعر امیر خسرو کی منظوم تاریخی مثنویاں ہیں۔ ان ادوار سے قبل یعنی غزنوی اور غوری سلطنتوں کے بارے میں یہاں کوئی الگ مستقل تاریخ نہیں ملتی۔ اول الذکر کتب تواریخ میں یوں تو بادشاہ کی ذات ہی محور توجہ ہے تاہم اس کی مختلف فتوحات اور تقریبات کے مواقع پر عوام کی بالواسطہ شرکت (یہ شرکت دلی طور پر اور اپنی مرضی سے بھی ہو سکتی ہے اور حکم کی مجبوری کے تحت بھی) کی جو تصویر کشی ان میں کہیں کہیں نظر آتی ہے وہ متعلقہ دور کی تمدنی اور معاشرتی زندگی کی ایک آدھ جھلک دکھا جاتی ہے۔ برصغیر میں سیکڑوں فارسی کتب تواریخ لکھی گئی ہیں۔ ان سب کی روشنی میں اس مضمون کو سمیٹنا انتہائی دشواری اور طوالت کا باعث ہوگا،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس لیے یہاں چند اہم کتب میں چھپی ہوئی ایسی چھوٹی چھوٹی تصویریں دکھانے کی کوشش کی گئی ہے جو قارئین کے لیے دلچسپی کا سامان کر سکیں۔ اگر کہیں کوئی تصویر مکرر آجائے تو اسے دو آتشہ سمجھ لیجیے۔

شروع کی تواریخ میں ہمارے سامنے چچ نامہ کا نام آتا ہے جو ۲۱۵ھ تا ۲۵۵ھ (۸۳۰ء تا ۸۶۹ء) کے درمیان لکھی گئی۔ اس کا مترجم علی بن حامد بن ابی بکر بن الکوفی ہے جو چھٹی صدی ہجری / بارھویں صدی عیسوی میں کوفہ سے اوچ پہنچا، اور یہاں قباچہ کے وزیر عین الملک سے وابستہ ہوا۔ بعد میں اوچ سے بھکر پہنچا، جہاں اس نے عربی میں لکھی ہوئی سندھ کی ایک تاریخ کو فارسی میں ڈھالا اور اسے چچ نامہ کے نام سے ۶۱۳ھ (۱۲۱۶ء) میں عین الملک کی خدمت میں پیش کیا۔ اس کتاب میں جو چند معاشرتی تصویریں نظر آتی ہیں ان کا تعلق ہندوؤں سے ہے کہ اس وقت مسلمانوں کی یہاں آمد کا ابھی آغاز ہوا تھا۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ اس وقت شرفا کی خواتین اور شاہی بیگمات وغیرہ پردے کی پابندی کرتی تھیں، چنانچہ اجنبیوں سے باتیں کرتے وقت وہ پردے کے پیچھے بیٹھتی تھیں، ستی کا عام رواج تھا۔ خواص اور عوام دونوں یوں تو مذہب کے پابند تھے لیکن اوہام پرستی میں بھی ان کا جواب نہ تھا کہ کوئی کام نجومی سے مشورہ کیے بغیر انجام نہ دیتے۔ زیادہ تر لوگ صنعت و زراعت سے وابستہ تھے، اور یہ عجیب بات ہے کہ اس وقت بدھوں اور برہمنوں کی آپس میں گاڑھی چھنتی تھی۔ محمد بن قاسم کے ذکر میں اہل سندھ کے ساتھ اس کے انتہائی حسن سلوک کی عکاسی دیکھنے میں آتی ہے۔

اس دوران میں جو چند تواریخ منظر عام پر آئیں ان میں یہ پہلو سرے سے غائب ہے، کہیں کوئی بھولے سے یا اتفاقاً چھوٹی موٹی بات آگئی ہو تو وہ الگ بات ہے۔ تا آنکہ ہم ساتویں / تیرھویں صدی میں پہنچ جاتے ہیں۔ امیر خسرو مشہور صوفی شاعر ہے، نثر نگار ہے، لیکن باقاعدہ ایک مؤرخ نہیں، اس کے باوجود اس نے تاریخ کے موضوع کو لیا اور عام مؤرخین سے ہٹ کے شعر میں اسے پیش کیا ہے جو اس کے زبردست تنوع ہونے کی دلیل ہے۔ خسرو کی پانچ مثنویاں تاریخی ہیں جب کہ صرف ایک تاریخ خزائن الفتوح نثر میں ہے۔ اس نے اس دور کی لڑائیوں وغیرہ کے علاوہ زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق بڑی دلچسپ جھلکیاں پیش کی ہیں۔ ان میں جہاں شاہی زندگی رواں دواں نظر آتی ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہاں عوامی زندگی بھی کسی حد تک اس میں شریک دکھائی دیتی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ خسرو کئی درباروں سے وابستہ رہا، شاہی درباروں کے علاوہ حضرت نظام الدین اولیا ایسے شاہان بوریا نشین سے بھی اس نے قلبی تعلق رکھا۔ ان کے یہاں خاص و عام کی آمد و رفت تھی، جس کے سبب خسرو کو دونوں قسم کے لوگوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا رہا اور اس طرح وہ ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور رہن سہن کے طریقوں سے آشنا ہوا۔ ہر چند شاعر مبالغے سے کام لیتا ہے اور خسرو نے بھی بعض مقامات پر شاعرانہ مبالغے سے کام لیا ہے تاہم جس انداز میں اس نے مختلف تہذیبی و تمدنی پہلوؤں کو لیا ہے، اس کی بنا پر اس کی تاریخی مثنویوں کو، اس ضمن میں مستند دستاویزات کی حیثیت حاصل ہے۔

اس سلسلے کی پہلی کڑی مثنوی قران السعدین ہے جو خسرو نے کیقباد کے ایما پر ۶۸۸ھ/۱۲۸۹ء میں تصنیف کی۔ اس میں باپ — بغرا خان بن غیاث الدین بلبن — اور بیٹے (معز الدین کیقباد) کے درمیان ناراضی اور صلح کا قصہ ہے، جس میں لشکر کشی تک کی نوبت آئی تھی۔ اس مثنوی میں فوجی معاملات کے علاوہ عمرانی حالات بھی آگئے ہیں اور معاشرت و تمدن کی دلچسپ تصویریں بھی قاری کا دامن کھینچتی ہیں، اور یہ سب کچھ اس وقت کی دلی سے متعلق ہے۔ اس کے مطابق اس وقت کی دلی بڑی فارغ البال تھی، اس لیے کہ وہ زیادہ تر امرا و شرفا کا مسکن تھی۔ لوگوں کی غالب توجہ آرایش و آسایش کی طرف ہونے کے سبب دلی کے گھر بہشت کا نمونہ پیش کرتے تھے۔ بقول خسرو اس دور کے بڑے بوڑھے گلی کوچوں کی نکڑ پر اکٹھے ہو بیٹھتے، پھر ہر گھر کے دروازے پر بیٹھنے کے لیے چبوترا بنا ہوتا، اور ظاہر ہے یہ اسی مقصد کے لیے تھا کہ لوگ کچھ دیر باہم مل بیٹھ کر وقت کٹی اور تجدید دوستی کرلیں، کہ اس وقت کا انسان آج کے انسان کی طرح اپنی خود پیدا کردہ مشکلات و مسائل میں نہیں گھرا تھا اور نہ اس کے اعصاب پر حصول مال و زر کا بھوت سوار تھا، اس کی ضرورتیں بھی تھوڑی تھیں اور فرصت زیادہ تھی۔ ان کے لیے چند لوگوں کا باہم مل بیٹھنا ہی سب سے بڑی دولت تھی جس کے حصول کے لیے انھوں نے مذکورہ طریقے اپنا رکھے تھے۔ خسرو کی اس مثنوی سے اس دور کے لوگوں کی حد سے زیادہ مہمان نوازی اور عام اخلاق

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا بھی پتا چلتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کے یہاں بکثرت آتے جاتے، اور یہ بھی کثرتِ فرصت کے سبب تھا۔ غالباً یہ اسی باہمی ربط و محبت کا نتیجہ تھا کہ ہر گھر میں مسرت و شادمانی تھی۔ لوگ زندہ دل، خوش خو، باہمی رواداری اور خلوص و محبت کا مجسمہ تھے۔ خسرو نے اس دور کی مذہبی صورت حال پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس کے مطابق لوگوں کے پابند صوم و صلوٰۃ ہونے کے باعث مسجدیں پوری طرح آباد رہتیں، وہ آج کی طرح مرثیہ خواں نہیں تھیں کہ نمازی نہ رہے۔ بالخصوص جامع مسجد میں نمازیوں کی زیادہ تعداد کے سبب ان کے اوراد و وظائف کی آواز مسجد سے باہر بھی سنائی دیتی۔

خسرو کے مطابق اس وقت لوگوں کو تفریحی مقامات پر جانے یا کسی دوسرے ڈھنگ سے تفریح کا سامان کرنے سے بڑی دلچسپی تھی، اور ایسے مقامات پر ان کے جانے کا انداز ایسا ہوتا جیسے وہ کسی جشن میں شریک ہو رہے ہوں۔ سلطان وقت نے دامنِ کوہ میں ایک بہت عمدہ حوض بنوایا تھا۔ اس حوض کو ایک بہت بڑے تفریحی مقام کی حیثیت حاصل تھی، جہاں لوگ ہر وقت ٹولیوں کی صورت اور رنگا رنگ لباس پہنے جمع ہوتے، ان کا یہ اجتماع میلے کی صورت پیدا کر دیتا۔

صنعت و حرفت میں اس دور کے لوگ صاحبِ کمال تھے۔ نازک سے نازک کام بھی ان کے لیے چنداں مشکل نہ تھا۔ پھر علم و ادب سے بھی ان کی دلچسپی کمال کی تھی، جس کے نتیجے میں اہل شعر و سخن کی تعداد کا کوئی شمار نہ تھا۔ اہل شعر و ادب کے ذکر کے بعد خسرو نے اہل موسیقی کی بات کی ہے۔ اس کے بقول اس وقت بڑے بڑے اور بے مثال گائیک موجود تھے۔ گویا عام لوگوں کو دوسرے فنون کے علاوہ موسیقی سے بہت رغبت تھی۔ خسرو کا کہنا ہے کہ عام لوگ تیر اندازی اور نیزہ بازی کی طرف بہت مائل تھے۔ پھلوں پھولوں سے لوگوں کی رغبت کے نتیجے میں برصغیر کے علاوہ خراسان کے پھل بھی بازاروں میں عام دستیاب تھے۔ خسرو نے پھلوں کی تفصیل تو نہیں دی البتہ چند پھولوں کے نام گنوا دیے ہیں جو اس وقت عام تھے۔ مثلاً گلاب، نرگس، سوسن، مروہ، نسترن، سپرغم، نیلوفر، ریحان، کیوڑہ، لالہ، سیوتی، بید، چنبیلی، مولسری، چمپا اور دونہ۔

قران السعدین میں ان عوامی جھلکیوں کے علاوہ شاہی دربار کی بھی بہت سی باتیں تمدن و معاشرت کے ذیل میں آتی ہیں۔ جشن نوروز اگرچہ آتش پرست ایرانیوں کا جشن تھا،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیکن اسلامی ادوار میں بھی یہ جشن ایران اور برصغیر میں باقاعدگی کے ساتھ منایا جاتا رہا۔ چنانچہ اس مثنوی میں بھی اس دور کے جشن نوروز کی تفصیل ملتی ہے۔ ایسے موقع پر ہر طرح کی زینت و آرائش سے کام لیا جاتا۔ ایک ایسے ہی جشن کے ذکر میں ایک مصنوعی باغ کی تصویر کشی ہے، جو بظاہر مبالغہ معلوم ہوتی ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس وقت ایسے ماہر صناع ضرور موجود ہوں گے جنھیں مصنوعی پھل پھول اور جانور بنانے میں اس قدر مہارت ہوگی کہ وہ ان میں اصل کی سی کیفیت پیدا کر سکیں۔ امیر خسرو کے مطابق مذکورہ باغ میں بنائے گئے درختوں کی شاخوں پر پھل اس طرح لٹک رہے تھے، جیسے ابھی ٹپک پڑیں گے۔ چڑیوں کی صورت ایسی تھی کہ جیسے ابھی اُڑ ہی کہ اُڑیں۔ یہ زریں باغ کہلوایا۔ ایک باغ میں سب اور دریا کے وسط میں بنایا گیا تھا۔ ایک اور باغ میں سب کچھ موم سے تیار کیا گیا اور تیسرے باغ کو مصنوعی پھولوں سے لاد دیا گیا۔

شاہی کھانوں کی تفصیل بھی اس مثنوی میں ملتی ہے۔ باپ بیٹے کی صلح اور ملاقات پر جو ضیافت ہوئی، اس میں بے شمار کھانے اور کئی اقسام کے حلوے دسترخوان پر چنے گئے۔ اور ظاہر ہے یہ کھانے روزمرہ کے معمول میں بھی شامل ہوں گے۔ تھوڑی سی تفصیل ملاحظہ ہو: نان تنک، بہت باریک روٹی تھی جس کے آر پار نظر آتا تھا۔ نان تنوری، مختلف جانوروں کا گوشت، بہت سی قسموں کے پلاؤ، جن میں سے ایک کھجوروں سے تیار کیا جاتا تو دوسرے میں انگور ڈالے جاتے۔ آب نبات کا شیرہ، ترش خمیر سے بنی ہوئی روٹی کاک، سنبوسہ، انگور اور کھجور سے تیار کردہ کھانا، کوداب جس میں غالباً چاول بھی ڈالتے تھے، دنبے کی چکتی، برّے، پہاڑی دنبہ، بکرے، تیتر اور بٹیر وغیرہ کا گوشت اور حلوہ جات میں تختۂ صابونی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان حلووں میں زعفران، کافور، اور عنبر ڈالا جاتا۔ پان، جسے آج اتنی اہمیت حاصل ہے کہ کسی بھی شہر کا کوئی بھی گلی محلہ پان کی دکان سے خالی نہیں ہے، اُس وقت بھی بڑا "عالی مقام" تھا۔ پان خوری کا رواج شاہ سے لے کر گدا تک سب میں تھا۔ خسرو نے اسے یہاں کے لوگوں کے لیے سب سے عمدہ نبات بتایا ہے۔ لوگ اس کی طرف اس قدر کیوں متوجہ تھے، خسرو اس کی وجہ بتاتا ہے۔ سب سے بڑی وجہ اور خاصہ یہ کہ وہ منہ کی بدبو دور کرتا ہے۔ اس کے چبانے سے دانت مضبوط ہوتے ہیں اور کھانا ہضم ہوتا ہے۔ بقول خسرو، کوئی شخص ہر چند پوری طرح

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شکم سیر کیوں نہ ہو اگر پان کھائے تو اسے پھر بھوک لگ جائے گی۔ خالی پیٹ پان کھانا بھوک کو ختم کرنا ہے۔ آج کوئی شخص کسی دوسرے کا جھوٹا پان کھانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا، لیکن وہ عجیب زمانہ تھا کہ اس وقت اسے عار نہ سمجھا جاتا تھا۔ پان کے دیگر اجزا کی بھی خسرو نے بات کی ہے، جس کے مطابق اس میں چونا کتھا ڈالا جاتا تھا، یعنی وہی کچھ جو آج استعمال میں لایا جاتا ہے بجز دو ایک قسم کے قوام وغیرہ کے۔ فرشتہ نے گلشن ابراہیمی (۱۰۱۵ھ/۱۶۰۶ء) میں پان کی اہمیت کا ذکر کیا ہے۔ اس کے مطابق ابراہیم عادل شاہ نے ایک موقع پر بعض امرا کی خطائیں معاف کرتے ہوئے انھیں خلعت اور پان سے نوازا تھا۔ خسرو کے مطابق اس دور میں پان کچھ اتنا جاندار تھا کہ کئی ماہ تک پڑا رہنے کے باوجود سوکھتا نہیں تھا، ممکن ہے اس میں خسرو نے شاعرانہ مبالغے سے کام لیا ہو، لیکن اس سے اتنی بات ضرور واضح ہو جاتی ہے کہ پان میں کافی دیر تک تازگی رہتی تھی۔ شاہی تحفوں میں زر و جواہر اور ہاتھی گھوڑے کے علاوہ صندل خالص، مشک ختن، گرم مسالہ اور کافور وغیرہ بھی شامل ہوتے۔

اُس دور میں باریک کپڑے کو امارت کی علامت سمجھا جاتا تھا جس سے پتا چلتا ہے کہ کپڑے کی صنعت کس حد تک ترقی یافتہ تھی۔ ایسا کپڑا تحفے میں دیا جاتا تھا۔ بعض اس قسم کے باریک کپڑے بُنے جاتے تھے کہ ان سے تیار کردہ لباس میں آدمی کا جسم نظر آتا تھا۔ یہاں پھر خسرو کا قول، محض مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کے مطابق بعض کپڑے اس قدر باریک تھے کہ لپیٹو تو انگلیوں کے ناخن میں آ جائیں (ممکن ہے یہ مراد ہو کہ انگلی پر لپیٹنے سے محض ناخن کی جگہ گھیرتے ہوں) اور کھولو تو ایک مکمل تھان بن جائے۔

اپنی دوسری مثنوی مفتاح الفتوح (سال تصنیف ۶۹۰ھ/۱۲۹۱ء) میں بھی جو سلطان جلال الدین خلجی کی دو ایک مہمات سے متعلق ہے، امیر خسرو نے اس دور کی عوامی اور شاہی زندگی اور بعض دیگر تمدنی و معاشرتی پہلوؤں کی عکاسی کی ہے جس میں آج کے قاری کے لیے خاصی دلچسپی کا سامان ہے (مثلاً یہ کہ کسی ملک پر لشکر کشی کے وقت حملہ آور فوج کثرت سے پرچم لے کر چلتی جس سے غالباً اس کا مقصد حریف فوج کو مرعوب کرنا ہوتا۔ چنانچہ جلال الدین کے ساتھ ایک موقع پر اس قدر لاتعداد علم اور پرچم تھے کہ ان کی وجہ سے نہ تو زمین پر دھوپ پڑتی تھی اور نہ آسمان پر نگاہ جا سکتی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھی۔ اس ضمن میں سُرخ رنگ کو فوقیت حاصل تھی۔ اسی باعث جلالی کی فوج کے جھنڈے یوں دکھائی دیتے تھے جیسے انار کے پھول کھلے ہوں۔ خسرو نے ان فوجی جھنڈوں کی اقسام کی چتر، علم، بیرق، رایت، تو بتائی ہیں لیکن یہ نہیں بتایا کہ ان پر کوئی خاص نشان بھی بنے ہوتے تھے۔ ہتھیاروں کی تفصیل کے علاوہ اس مثنوی سے اس وقت کی فوجی حکمت عملی کا بھی پتا چلتا ہے اور وہ یہ کہ لشکر کشی کے وقت سیکڑوں اونٹوں پر پانی لاد کر لے جاتے تھے تاکہ ایسے علاقوں سے گذرتے وقت فوج کو کوئی دشواری نہ ہو، جہاں پانی دستیاب نہیں۔

اس مثنوی سے اس دور کی گچ کاری اور سنگ تراشی پر بھی روشنی پڑتی ہے ۔ یہ دونوں فن اس وقت اپنے عروج پر تھے اور ان کے ماہر حیرت افزا کام سرانجام دیتے تھے۔ خوشبوئیات کی طرف لوگوں بالخصوص امرا وغیرہ کی بے حد توجہ تھی۔ بڑے بڑے لوگ اپنی آرام گاہیں بیشتر خوشبودار لکڑی سے بنواتے۔ فنون لطیفہ میں رقص و سرود کو بھی اہمیت حاصل تھی۔ چنانچہ خوشی کی ہر تقریب اور ہر جشن میں یہ سلسلہ چلتا تھا۔ مختلف جشنوں کے مواقع پر جس طرح آج ہم اپنے شہروں اور گلی کوچوں کو دروازوں، محرابوں اور قمقموں وغیرہ سے آراستہ اور گروہوں کی صورت میں ڈھول کی تھاپ پر رقص کر کے اپنی خوشی و مسرت کا اظہار کرتے ہیں، اسی طرح پہلے بھی اس اظہار کی یہ روش رہی ہے۔ چنانچہ بقول خسرو، جھاین کی فتح پر دلی میں زبردست جشن منایا گیا ۔ دروازوں اور محرابوں کو آرائشی اشیا سے اس طرح سجایا گیا تھا کہ پورا شہر دلہن کی تصویر پیش کر رہا تھا، اور یہ کہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر رقص کی محفلیں جمی ہوئی تھیں۔ سازندے بھی اپنے فن کی داد لینے میں مصروف تھے۔ خسرو نے یہ چند ساز گنوائے ہیں، نَے، حرارہ، دف، رود، رباب، موچنگ، ڈھول تاشے اور نوبت کا بھی اپنا ایک مقام تھا۔ ایسے موقعوں پر نوبتی جگہ جگہ نوبتیں بجاتے اور عام لوگ گھروں کی چھتوں پر ڈھول پیٹ پیٹ کر اظہار مسرت و شادمانی کرتے ۔

خسرو کی تیسری مثنوی دول رانی خضر خاں (مصنفہ ۷۱۵ھ/ ۱۳۱۵ء) رزم اور بزم دونوں پر مشتمل ہے۔ اس میں بھی اس دور کی معاشرتی اور تمدنی زندگی کی دلچسپ تصویریں فلم کی طرح چلتی نظر آتی ہیں۔ ان میں لوگوں کی پھولوں سے دلچسپی، وہی پان کا ذوق،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور پھلوں کا ذکر ہے جو آج بھی دستیاب ہیں۔ البتہ خسرو نے جس انداز میں آم اور انجیر کا تقابل کیا ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ اس وقت انجیر کو ایک خاص حیثیت حاصل تھی۔

ارباب اقتدار و اختیار اور عوام الناس کو پھولوں سے دلچسپی کے ذیل میں خسرو نے پھولوں کے نام بتائے ہیں اور ان کی خوشبو کی دیرپائی کی بات کی ہے۔ خراسان سے آنے والے پھولوں میں بنفشہ، یاسمین، نسترن اور نسترین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ البتہ برصغیر کے فارسی ناموں والے پھولوں کے بارے میں خسرو کا کہنا ہے کہ وہ صرف یہیں کی پیداوار ہیں، ورنہ ایران میں ان کے اپنے نام ہوتے۔ یہ پھول ہیں: گلِ صد برگ اور گل کوزہ۔ خوشبو اور خوب صورتی کے لحاظ سے یہاں کے ایک پھول کیوڑہ کی ٹکر کا کوئی پھول نہ تھا۔ اس کی خوشبو کا یہ عالم تھا کہ پھول سوکھنے پر بھی ایک مدت تک قائم رہتی تھی۔ رائے چنپہ زرد رنگ کا اور بڑا خوشبو دار پھول تھا جو تیل نکالنے کی خاطر کاشت کیا جاتا تھا جیسے لوگ سروں پر لگاتے تھے۔ آج جسے ہم سورج مکھی کہتے ہیں وہ بھی زرد رنگ ہی کا اور تیل والا پھول ہے، لیکن اس کی خوشبو اتنی نہیں ہے، ممکن ہے یہی وہ پھول ہو اور خسرو نے خوش بو کے معاملے میں مبالغے سے کام لیا ہو۔ ان پھولوں کے علاوہ چند اور پھولوں کا تذکرہ ان کی شکل و صورت اور خوشبو کی تفصیل کے ساتھ اس کتاب میں آیا ہے، جو کچھ اس طرح ہے۔ مولسری (مولسری) مروارید رنگ کا تھا، اس کی مہک کے آگے صندل ہیچ تھا۔ اس کی خوش بو میں ایک خاص مستی تھی، پتیاں چھوٹی اور باریک اسے سینے پر لگانے کا فیشن عام تھا۔ خشک ہونے پر بھی اس کی مانگ کم نہ ہوتی، لوگ اس عالم میں بھی اسے دوسرے شہروں میں لے جاتے (گویا یہ پھول زیادہ تر دلی ہی میں تھا۔) خسرو نے اس کی خوش بو کو نافۂ مشک کے ہم پلہ قرار دے کر بتایا ہے کہ حسینائیں اس پھول کے ہار پہنتی تھیں۔ اسی طرح سیوتی پھول کی خوشبو کی بڑی تعریف کی گئی ہے، جس کی پتیاں شکر رنگ کی ہوتی تھیں۔ یہ بھی حسیناؤں کا پسندیدہ پھول تھا۔ کرنہ کھلتا تو پورا محلہ اس کی خوش بو سے مہک اٹھتا۔ قرنفل کو خسرو برصغیر کا گلاب کہتا ہے جس کے آگے لالہ و ارغواں ہیچ ہیں۔ دونہ کو یہاں کا ریحان کہا جا سکتا ہے۔

اس مثنوی میں شہزادہ خضر خاں کی پہلی شادی کی جو تفصیل آتی ہے وہ حیران کن بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کے اعلیٰ طبقے میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہندوؤں کی بہت سی رسوم رواج پا چکی تھیں۔ یہ بات حیرت افزا ہے کہ شاہی خاندان کے صرف ایک فرد کی شادی پر سرکاری خزانہ، کہ حقیقت میں عوام الناس کا مال تھا، کسی بُری طرح لٹایا جاتا تھا۔ پھر یہ کہ ایسے مواقع پر اگر ایک طرف غیر شرعی حرکات کھلے بندوں ہوتی تھیں تو دوسری جانب مذہب اور قرآن و سنت سے وابستگی کا اظہار بھی زور و شور سے کیا جاتا، اور یہ دونوں باتیں بیک وقت شہر کے مختلف گوشوں، کوچوں میں جاری رہتیں۔ خسرو کے مطابق اس شادی پر خزانوں کے خزانے اٹھ گئے۔ دیگر بڑے بڑے جشنوں کی طرح اس جشن پر بھی شہر کی آرائش حسب سابق کی گئی بایں تفاوت کہ شاہی محل کے اردگرد بڑے بڑے کلس بنائے گئے جو ناظر کے لیے باعث حیرت تھے۔ کلس اور محراب کچھ اس کثرت سے بنائے گئے تھے کہ وہ دریا میں بارش کے باعث بننے والے لاتعداد بلبلوں کا منظر پیش کر رہے تھے۔ پورے شہر اور ہر گلی، کوچہ و بازار کو ازحد آراستہ کیا گیا، خیمے اور ڈیرے بھی خوب بکثرت نصب کیے گئے۔ شامیانوں اور زریں پردوں کی الگ بہار تھی۔ تصویروں سے لوگوں کی دلچسپی کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ تمام دیواروں اور دروازوں پر تصویریں لٹکائی گئیں اور عجیب و غریب نقش و نگار سے انھیں سجایا گیا۔ اس سے ہٹ کر اس وقت کی نقاشی کا اندازہ بھی سامنے آتا ہے، دیواروں پر دوڑتے گھوڑوں اور اُڑتی پریوں کی مورتیں بنائی گئیں۔ اس زمانے میں ریشمی فرش کثرت سے استعمال میں لائے جاتے تھے، چنانچہ خسرو کے بقول اس موقع پر یہ فرش اس حد تک بچھائے گئے کہ زمین نظر نہ آتی تھی۔

کرتبوں کے مختلف انداز تھے۔ شمشیر زن اپنے انداز کے کرتبوں سے تماشائیوں کا دل لبھاتے، جن میں سے ایک اڑتی مکھی کو دو ٹکڑے کرنا تھا۔ نٹ، مداری اور شعبدہ باز ایسے مواقع پر الگ، اپنی مہارت اور پھرتی کے کرتب دکھاتے۔ شہزادے کی شادی پر ان لوگوں نے جگہ جگہ اکھاڑے جما کر مختلف قسم کے کرتبوں سے اکھاڑوں کو لوٹا۔ ان کرتبوں میں ڈھول کی تھاپ پر مسلح نٹوں کا قلابازیاں لگانا، خنجر کے مختلف کرتب، گیند آسمان کی طرف اُچھالنا۔ ناک کے راستے چاقو چڑھا لینا، پھر سے پر بڑے ہی خطرناک اور جان لیوا کرتب آتے ہیں۔ اب بعض بڑے ملکوں میں ایسے کرتب دکھانے والوں کی تربیت کے لیے باقاعدہ اکادمیاں قائم ہیں اور ان لوگوں کے کرتب بھاری ٹکٹ پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دکھائے جاتے ہیں۔

موسیقی کی بات، پہلے ہو چکی۔ معلوم ہوتا ہے وہ لوگ اس کے بے حد رسیا تھے اور مختلف جشنوں پر گانے والی عورتیں اور رقاصائیں اپنے فن کا مظاہرہ کھلے عام جگہ جگہ کیا کرتی تھیں۔ خسرو نے ان عورتوں کے لباس اور اداؤں کا بھی ذکر کیا ہے۔ چند سازوں کے نام اوپر گزر چکے، چند نام اور ملاحظہ ہوں: بربط، طنبور، الاون (کدو سے بنایا جاتا اور بڑا پُرسوز ساز تھا) تال (پیتل کا بنا ہوا دف کی مانند ہاتھوں میں اٹھاتے تھے۔) تنبک، حمیر خام اور عجیب رود۔

داد و دہش کا یہ عالم تھا کہ بقول خسرو اس ایک شادی کے موقع پر جگہ جگہ منجنیقیں نصب کی گئیں اور ان میں گولا بارود بھرنے کی بجائے اشرفیاں اور روپے بھر کر خوب خوب لٹائے گئے۔

خسرو کی یہ مثنویاں اس دور کے ایک زبردست تضاد یا دو انتہاؤں کو سامنے لاتی ہیں۔ مختلف مواقع پر رقص و سرود کی کثرت اور اس کے سبب لوگوں کی گہما گہمی کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ایمان افروز مجالس بھی ان موقعوں پر کثرت سے ہوتیں جن میں اہلِ تقویٰ بڑی تعداد میں شریک ہوتے، اہلِ عبادت کے خیموں کی کوئی حد نہ ہوتی، ان خیموں میں قرآن خوانی کے علاوہ احادیث رسول مقبول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پُرسوز قرأت بھی زوروں پر ہوتی۔

بڑے لوگوں میں، جیسا کہ پہلے بیان ہوا، شادی بیاہ کے مواقع پر ہندوؤں کی طرح شبھ گھڑی دیکھنے کا رواج تھا۔ شادی سے پہلے ستارہ شناس یہ گھڑی مقرر کرتے۔ اس کے ساتھ ہی یہ اسلامی انداز بھی رائج تھا کہ جب دولھا گھوڑے پر سوار ہوتا تو سارے باراتی زور سے "بسم اللہ" کہتے۔ نظر بد سے بچنے کے لیے بہت سے لوگ ہاتھوں میں تلواریں اور خنجر لیے بارات کے ساتھ ساتھ چلتے۔ راستے میں دولھا پر زر و یاقوت نچھاور کیے جاتے، یہ تو بڑے لوگوں اور حکمرانوں کی شادی بیاہ کی رسمیں تھیں، اور ظاہر ہے کہ عام لوگ بھی ان کی حسب توفیق نقل کرتے ہوں گے کہ الناس علی دین ملوکھم۔ دولھا جب دلہن کی طرف جاتا تو پہلے ایک کرسی پر بیٹھتا، اور اس موقع پر بھی اس پر کچھ نہ کچھ نچھاور کیا جاتا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خسرو کے اس مصرعہ: "چو یک شنبہ کہ ہست آں روز خورشید" کو پیش نظر رکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان بھی اس وقت، عیسائیوں کی طرح، اتوار کو سورج کا دن قرار دیتے تھے۔ بقول خسرو اس وقت شمشیر اور نمک کی قسم کھانے کا رواج عام تھا۔ یہ بات ان کی دلیری اور نمک حلالی کی غمازی کرتی ہے۔ خزائن الفتوح کے مطابق علاء الدین خلجی کے زمانے میں اوزان اور پیمانوں کی طرف حکومت نے خاص توجہ کی۔ باٹ وغیرہ لوہے کے بنائے گئے۔ گراں فروشوں اور کم تولنے والے دکان داروں سے نمٹنے کے لیے ایمان دار افسر مقرر ہوتا جو انھیں ان جرموں پر سزا دیتا۔ اس سے یہ خرابی دور ہو گئی۔ خلجی کے دور میں بے حیائی کی روک تھام، شراب کی بندش، حرام کی کمائی کھانے والوں کے استیصال اور زبردست عدل و انصاف کے باعث لوگوں کی زندگی پُرسکون تھی۔ چوری، ڈاکا، جیب تراشی سخت سزاؤں کے سبب ختم ہو گئے اور راستے پُرامن ہو گئے۔ غلہ کی ارزانی نے بھی لوگوں کی زندگی کو پُرسکون بنا رکھا تھا۔ بارش نہ ہونے کی صورت میں سرکاری گودام رعایا کو غلہ دیا جاتا۔ یہ گویا آج کی اصطلاح میں راشن ڈپو تھا۔ اس دور میں فیئر پرائس شاپ یا بالکل جدید اصطلاح میں جمعہ بازار کا وجود بھی قدرے تفاوت کے ساتھ نظر آتا ہے، یعنی "دار العدل" نام کا ایک ادارہ قائم تھا جہاں سے مختلف قسم کے سوتی اور ریشمی کپڑے از قسم بہاری، گل بافتی، خز، شعر، گلیم کے علاوہ پھل وغیرہ سستے داموں ملتا تھا۔ اسلام دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کے احترام کا درس دیتا ہے، جس پر ہر دور کے مسلمان حکمران نے پوری طرح عمل کیا ہے۔ خلجی کی سلطنت میں اہلِ ہنود کے مندر پوری طرح سے محفوظ تھے اور کسی کو جرأت نہ تھی کہ وہ انھیں کوئی نقصان پہنچا سکے۔

سلطان فیروز شاہ تغلق نے جو ۷۵۲ھ/۱۳۵۱ء میں تخت نشین ہوا اپنی مختصر سی کتاب "فتوحات فیروز شاہی" میں اپنی فتوحات اور اصلاح معاشرہ سے متعلق اپنی کارگزاریوں کا ذکر کرنے سے پیشتر خدائے بزرگ و برتر کا بے انتہا شکر ادا کیا ہے کہ اس نے اسے اس امر کی توفیق سے نوازا کہ وہ سنت نبویؐ کو از سر نو رائج کر کے بدعتوں، ناجائز کاموں اور بُری باتوں سے لوگوں کو روکے اور فرائض و واجبات پر عمل پیرا ہونے پر مائل کر سکے۔ اس کتاب سے پتا چلتا ہے کہ اس سے قبل بڑی سخت سزائیں رائج تھیں جنھیں اس نے یکسر ختم کر دیا۔ فیروز شاہ کے مطابق گذشتہ زمانے میں مسلمانوں کا خون ناحق بُری طرح بہایا جاتا تھا انھیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مختلف اذیتیں دی جاتیں۔ سلطان نے اس کا انتظام کیا کہ لوگوں کا خون ناحق نہ گرایا جائے۔ اس نے سخت سزائیں ختم کر دیں۔

فیروز شاہ تغلق کے عہد سے قبل لوگوں پر مختلف ٹیکس اور محصول عائد تھے، اس نے انھیں ختم کیا، اس لیے کہ اس کا عقیدہ تھا کہ لوگوں کی جمعیت خاطر، خزانہ اکٹھا کرنے سے کہیں بہتر ہے اور لوگوں کی پریشان حالی کی نسبت خزانے کا خالی رہنا زیادہ مناسب ہے۔ ذرا ٹیکسوں کے نام ملاحظہ ہوں: منڈوی برگ (سبزی وغیرہ کی فروخت پر ٹیکس) دلالت بازارہا (منڈیوں کے کمیشن ایجنٹوں پر)، امیری طرب (تفریح یا انٹرٹینمنٹ ٹیکس)، گل فروشی (واضح ہے)، جزیۂ تنبول (تمباکو کی فروخت پر ٹیکس) چنگی غلہ (غلہ منڈی میں لانے پر) نیلگری (نیل کے پودے سے نیلا رنگ بنانے پر) ماہی فروشی (مچھلی پر) ندافی (جولاہگی) صابون گری، ریسمان فروشی (رسی)، روغن گری (تیل نکالنے پر ٹیکس) نخود بریان (بھنے ہوئے چنے کی فروخت) تہ بازاری (زمین پر بیٹھ کر یا چل پھر کر اشیا فروخت کرنے والوں پر ٹیکس) چھپّنہ (سرکاری سڑکوں پر دھوپ اور بارش سے بچنے کے لیے، چھت یا چھپّا بنانے والوں سے) دادبیگی (گویا اسٹامپ فیس) کوتوالی (بعض کے نزدیک پولیس ٹیکس، بعض کے نزدیک کوئی انتظامی ٹیکس) قصّابی، لوزہ وخشت پزی (بھٹیوں میں مٹی کے برتن اور اینٹیں پکانے پر) چرائی (دودھ دینے والے جانوروں پر) اور مصادرات (مختلف قسم کے جرمانے)۔

اس کے بعد مغلیہ دور کی کتب تواریخ سامنے آتی ہیں جن میں بابر (م ۹۳۷ھ/۲۷ دسمبر ۱۵۳۰ء) کی خودنوشت تزک بابری سرفہرست ہے۔ بابر ایک باقاعدہ مؤرخ تو نہیں، البتہ تاریخ ساز ضرور تھا اور اسی بنا پر اس نے جو کچھ لکھا وہ تاریخ کی ذیل میں آتا ہے۔ تزک بابری ترکی زبان میں ہے جسے بعد میں اکبر کے ایما پر عبدالرحیم خان خاناں نے فارسی کا روپ دیا۔ اس میں اس نے برصغیر کی جغرافیائی معلومات کے علاوہ یہاں کی زندگی کی باتیں کی ہیں اور تمدنی و معاشرتی حالات کے بارے میں بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یہ سب باتیں اس کے مشاہدے اور غیر معمولی دماغ کی غمازی کرتی ہیں۔

یہاں کے شہروں اور عوام کے بارے میں اس کے خیالات اچھے نہیں ہیں۔ اس نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ عجیب بات بتاتی ہے کہ برصغیر کے شہر اور دیہات جس قدر سرعت سے آباد ہوتے ہیں اُسی سرعت سے ویران ہو جاتے ہیں اور یہ کہ بڑے بڑے شہروں کے لوگ جب بھاگنے پر آتے ہیں تو اپنا نشان تک چھوڑ کر نہیں جاتے۔ اس کی کوئی وجہ اس نے نہیں لکھی۔ معلوم ہوتا ہے جن جن مقامات سے وہ گزرا یا ٹھہرا ہے وہاں کے لوگ زیادہ تر خانہ بدوشوں کی سی زندگی بسر کرتے ہوں گے، اور ظاہر ہے خانہ بدوش کہیں جم کر نہیں بیٹھتے۔ بابر کا یہ قول بڑی حد تک اس کی تصدیق کرتا ہے کہ یہاں کے لوگ مکانوں کی بجائے جھونپڑیوں میں رہتے ہیں، اور اگر کہیں آباد ہونا چاہیں تو وہاں تالاب بنا لیتے یا کنواں کھود لیتے ہیں۔ مکان نہیں بناتے۔ توزک بابری سے پتا چلتا ہے کہ اس دور میں برصغیر پاک و ہند اور خراسان[1] کے درمیان خشکی میں بڑے بڑے تجارتی مرکز تھے۔ کابل اس وقت خراسان اور برصغیر کے درمیان ایک واسطہ ہونے کے علاوہ بہت بڑی تجارتی منڈی تھا۔ بابر نے برصغیر کی طرف آنے والے اسباب و اشیا کا ذکر تو نہیں کیا البتہ یہ بتایا ہے کہ برصغیر سے ہر سال پندرہ بیس ہزار آدمیوں کے قافلے کابل جاتے تھے۔ یہ لوگ اپنے ساتھ غلام، سفید کپڑا، کھانڈ، مصری اور نبھا تیز (؟) وغیرہ لے کر جاتے۔

اس توزک سے حاکموں اور حکمرانوں کی کتابوں سے بابر کی دلچسپی کا پتا چلتا ہے۔ بابر نے سیال کوٹ، پسرور اور کلانور کا ساتھ ساتھ قلعہ بلوت کا تذکرہ کیا ہے جو ان کے قریب ہی کہیں ہو گا۔ اس قلعے کے حاکم غازی خان کا کتب خانہ ایسی کتابوں پر مشتمل تھا۔ اور یہ کتابیں غالباً مذہب سے متعلق تھیں کیونکہ بقول بابر زیادہ کتابیں ملاؤں کے مطلب کی تھیں، اس نے یہ کتابیں ہمایوں اور کامران کو دے دیں۔

شاہان بوریا نشین یہاں ہر دور میں شاہان اورنگ نشین کی توجہ کا مرکز رہے ہیں، کیا زندگی میں اور کیا مرنے کے بعد۔ چناں چہ بابر بھی حضرت نظام الدین اولیاؒ اور حضرت خواجہ قطب الدین (بختیار کاکی) کے مزاروں پر حاضری دیتا نظر آتا ہے۔ اس

---

[1] خراسان سے مراد برصغیر سے ہٹ کر جو بھی علاقے ہیں، بابر نے اس کی وضاحت یوں کی ہے کہ جس طرح عرب دوسرے ملکوں کو عجم کہتے ہیں، اسی طرح یہاں کے لوگ دوسرے ملکوں کو خراسان کا نام دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو توزکِ بابری اردو ترجمہ مطبوعہ مکتبہ اردو لاہور ص ۲۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مقالے کے شروع میں 'چچ نامے کے حوالے' سے مسلمانوں (محمد بن قاسم) کے ہندوؤں کے ساتھ حسن سلوک کا ذکر ہوا ہے۔ یہ حسن سلوک مسلمانوں نے ہر زمانے میں روا رکھا ہے۔ چنانچہ گوالیار کے راجہ بکرما جیت کے مرنے کے بعد اس کے بال بچوں کی حفاظت کا ہمایوں نے پورا پورا انتظام کیا، یہ لوگ اس وقت آگرہ میں تھے۔

یہاں کی لم لطافتی کی بات کرتے ہوئے اس نے یہاں کی کئی چیزوں اور باتوں کو ہدف تنقید بنایا ہے۔ اس کے مطابق برصغیر کے باشندے نہ تو مجلسی ہیں اور نہ خوب صورت، وہ ان کی بے مروتی اور بے عنایتی اور ان کے ادب سے عاری ہونے کا ذکر کرتا ہے۔ اس دور میں بازاروں میں بکنے والی کھانے پینے کی چیزوں کو بھی وہ ناقص قرار دیتا ہے۔ عام پیشوں سے متعلق لوگوں کی کثرت کا ذکر کرتے ہوئے اس نے سنگ تراشوں کی خاص طور پر بات کی ہے۔ اس وقت یہ فن اور پیشہ گویا عروج پر تھا۔ بابر کے مطابق اس سے پہلے تیمور نے جب سنگین مسجد بنوائی تو اس نے یہاں سے بھی سنگ تراش منگوائے تھے۔ خود بابر نے آگرے میں اپنی زیر تعمیر عمارت کے لیے سیکڑوں سنگ تراشوں کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں، جن میں سے چھ سو اسّی سنگ تراش صرف آگرے کے تھے۔ ان کے علاوہ بعض دوسرے شہروں میں اس کی عمارات پر ایک ہزار چار سو اکیانوے سنگ تراش روزانہ کام کرتے تھے۔ یہ لوگ جیسا کہ اس نے لکھا ہے، پشتینی سنگ تراش تھے۔ اس کے علاوہ یہاں ہر حرفت کے پیشہ وروں کی بھی کثرت کا اس نے ذکر کیا ہے۔

جب کوئی حاکم یا بادشاہ کہیں چڑھائی کرتا تو فوج کے ساتھ ساتھ سوداگر اور طالب علم بھی روانہ ہوتے۔ راستے میں دوسرے لوگوں کی طرح انھیں بھی انعامات سے نوازا جاتا۔ بابر کی فوج میں افغان، ہزارہ، عرب اور بلوچ یعنی سبھی مسلمان تھے، لیکن اس کے باوجود اسے یہاں مسلمانوں بالخصوص چھوٹے چھوٹے مسلمان حکمرانوں ہی کی نفرت کا سامنا کرنا پڑا، جس کا ذکر کیے بغیر وہ نہ رہ سکا۔ اس کے برعکس اس کے بعض امرا وغیرہ کو برصغیر سے سخت نفرت تھی۔ چنانچہ خواجہ کلاں یہاں سے جاتے ہوئے اپنے مکان کی دیوار پر یہ شعر لکھ گیا ؎

اگر بخیر و سلامت گذار سند شود　　سیاہ روی شوم گر ہوای ہند شود

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(اگر میں سندھ سے بخیر وخوبی گذر گیا تو میرا منہ کالا ہو جو پھر کبھی میں نے ہند کی خواہش بھی کی۔)

مسلمان حکمرانوں کو ہمیشہ عمارات کی تعمیر کے علاوہ باغات، خوب صورت حماموں، اور حوضوں کا بہت شوق رہا ہے، ان پر وہ خاصا سرمایہ صرف کرتے تھے، یہ سب ان کے اعلیٰ ذوق کی علامت تھی۔ حمام بذات خود ایک اچھی خاصی عمارت ہوتی تھی چنانچہ ایک جگہ بابر اپنے ایما پر بنائے گئے حمام اور حوض کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ برصغیر کے لوگوں نے اس وضع قطع کے مکان کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھے تھے۔

اس دور میں آج کے سے آلات کا تو ذکر ہی کیا، معمولی مشینیں وغیرہ بھی نہ تھیں جن سے اسلحہ تیار کرنے میں کوئی مدد ملتی، پھر بھی اس معاملے میں مسلمانوں کی مہارت کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔ چنانچہ ایک موقع پر ایک شخص علی قلی نے ایک توپ ڈھالی جس کا گولہ چھ سو قدم (تقریباً ڈیڑھ پونے دو ہزار فٹ) پر جا کر گرتا تھا۔ یہ لوگ صرف توپیں وغیرہ ڈھالنے ہی میں ماہر نہ تھے بلکہ اس فوجی حکمت عملی سے بھی بخوبی آگاہ ہوتے تھے کہ لڑائی کے وقت توپ نصب کرنے کے لیے کون سی جگہ مناسب رہے گی۔ بابر کی ایک بات سے اس دلچسپ نسخے کا پتا چلتا ہے کہ اس وقت لوگ شراب میں نمک ڈال کر اس کا سرکہ بناتے تھے۔

مسلمان حکمران شہروں کے درمیان فاصلوں کی پیمائش کا بہت اہتمام کرتے تھے۔ فاصلوں کی نشان دہی کے مختلف طریقے تھے، جن میں سے ایک کا ذکر تزک بابری میں بھی ملتا ہے۔ ایک موقع پر بابر نے آگرہ سے کابل تک جریب سے پیمائش کرنے اور ہر نو کوس پر بارہ گز اونچا مینار، جس پر ایک چہار دری ہو، بنانے کا حکم دیا اور یہ کہ ہر اٹھارہ کوس پر چھ گھوڑوں کی ڈاک چوکی بٹھائی جائے۔ اس کام کے لیے شاہی تمغاچی مقرر کیا جاتا تھا جس کے ساتھ کئی محرر کام کرتے۔ بابر نے اپنی وضع کردہ پیمائش کی تفصیل اس طرح دی ہے: نو مٹھی کا گز، چالیس گز کی جریب اور سو جریب کا ایک کوس۔

ہمایوں کے دور کی جو دو تین چھوٹی بڑی تاریخیں لکھی گئیں، ان میں بھی اگرچہ بادشاہ کی ذات ہی مرکز توجہ ہے تاہم بعض باتیں ان میں ایسی بھی آ گئی ہیں جو اس دور کی معاشرت و تمدن کی دلچسپ عکاسی کرتی ہیں۔ اس دور میں بھی مسلمانوں کے طرز

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زندگی سے ہندوؤں کی بعض رسوم کی چھاپ صاف دکھائی دیتی ہے، جن میں "شبھ گھڑی" یا "نیک ساعت" کا تعین خاص طور پر قابل ذکر ہے، اگرچہ ایران کے بعض بادشاہوں نے کہیں روانگی سے قبل منجّمین سے مشورہ کیا ہے، لیکن اس کا تعلق اس قسم کے تعین سے نہیں ہے، یہ خالصتاً ہندوانہ رسم ہے، اس لیے کہ اسلام کی رو سے سب دن یکساں ہیں کسی میں کوئی بُرائی نہیں۔ ہمایوں نامہ یا قانون ہمایونی (۹۳۷ھ/۱۵۳۰ء) کے مؤلف غیاث الدین محمد عرف خواند میر کے مطابق ہمایوں کسی عمارت کی تعمیر سے قبل شبھ گھڑی کا تعین کرواتا تھا، اس کے بعد بڑے بڑے مشائخ، علما، ائمہ اور ذی احترام سادات بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اس عمارت کی تکمیل وغیرہ کے لیے دعا کرتے۔ تعمیرِ عمارت کے آغاز کا انداز یہ تھا کہ بادشاہ دعا کے بعد پہلی اینٹ رکھتا، پھر مذکورہ حضرات ہاتھوں میں چند پتھر اور اینٹیں اٹھا کر معماروں کو دیتے اور کام شروع ہو جاتا۔ تذکرۃ الواقعات (۹۹۵ھ/۱۵۸۷ء) کے مطابق مختلف اشیا سے شگون لینے کا بھی رواج تھا۔ چنانچہ ہمایوں نے اکثر جانوروں اور پرندوں سے شگون لیا۔

تیروں کو مختلف لوگوں اور منصب داروں سے منسوب کیا جاتا تھا۔ ہمایوں نے مختلف قسم کے بارہ تیر اختراع کیے تھے۔ آخری یعنی بارھواں تیر سرخ سونے کا تھا جسے وہ اپنے ترکش میں رکھتا، گیارھواں تیر اخوان و اقربا سے، دسواں تیر مشائخ و سادات کبار اور اکابر علما سے، نواں تیر بڑے بڑے علما سے اور آٹھواں تیر داروغہ شہر اور مقربین سے منسوب کیا گیا، باقی تیر بھی اسی طرح مختلف طبقوں سے منسوب تھے۔ قانون ہمایونی میں ان تیروں کے تین تین درجوں، اعلیٰ، اوسط اور ادنیٰ کا ذکر ہے لیکن ان کی تفصیل نہیں ہے کہ کس بنا پر انھیں کسی درجے میں رکھا جاتا تھا۔ اسی کتاب کی رُو سے ہمایوں کو گویا اختراعات کا بڑا شوق تھا، چنانچہ مذکورہ تیروں کے علاوہ اس نے یہ عجیب اختراع کی ـــ یہ اختراع اسی تک رہی، نہ اس سے پہلے اس کا کوئی وجود تھا اور نہ اس (ہمایوں) کے بعد یہ برقرار رہی ـــ کہ عناصر اربعہ کی مناسبت سے چار وزیر مقرر کیے: "سرکار آتشی": توپ خانہ، ترتیب اسلحہ و آلاتِ حرب سے متعلق وزارت۔ "سرکار ہوائی": باورچی خانہ، اصطبل خانہ، توشہ خانہ کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وزارت۔ "سرکار آبی": امور شربت خانہ، شراب خانہ، نہروں کے اجرا اور سمندر سے متعلق مہمات کی وزارت۔ "سرکار خاکی": زراعت وعمارت کی مہمات اور ضبط خالصات وغیرہ کی وزارت۔ لباس دن کی مناسبت سے پہنا جاتا۔ ہفتے کے دن کہ اس کا تعلق زحل سے ہے، سیاہ لباس۔ سوموار چاند سے منسوب ہے، ہمایوں پورے چاند کے موقع پر سفید بصورت دیگر سبز لباس پہنتا۔

۱۹۶۵ء کی پاک ہند جنگ میں ہماری ایک توپ کو "رانی" کا نام دیا گیا تھا، یہ کوئی نئی بات نہیں، اس سے صدیوں پہلے توپوں کے نام انسانوں کے ناموں پر رکھے جاتے تھے چنانچہ تذکرۃ الواقعات کے مطابق والی گجرات سلطان بہادر کی دو توپوں کے نام لیلیٰ اور مجنوں تھے۔ آج سربراہان مملکت کے عوامی استقبال کے لیے مختلف ذرائع ابلاغ سے لوگوں کو آگاہ کرکے اکٹھا کیا جاتا ہے۔ جب یہ ذرائع نہیں تھے تو منادی کے ذریعے لوگوں کو اکٹھا کیا جاتا تھا۔ ہمایوں جب ایران جاتے ہوئے ہرات سے گزرا ہے تو وہاں کے حکمران نے یہ منادی کرائی کہ سات برس سے ستر برس تک کی عمر کے لوگ اس کے استقبال کے لیے اکٹھے ہوں۔

بزرگوں کے مزاروں پر جلنے والے چراغوں کا گُل کترنا باعثِ سعادت سمجھا جاتا تھا۔ سفر ایران کے دوران جب ہمایوں نے امام علی رضا کے روضے پر حاضری دی تو وہاں کے متولی نے ہمایوں کو اس کی اجازتِ خاص دی، جس پر اس نے قینچی سے چراغ کا گُل کترا۔

آج جب کوئی سربراہ مملکت کسی دوسرے ملک میں مہمان بن کر جاتا ہے تو وہاں مہمان کے علاوہ وہ ایک آدھ موقع پر میزبان بھی بن جاتا ہے اور اسی سرزمین پر اپنے میزبانوں کو بطور مہمان مدعو کرتا ہے۔ یہ رسم بھی پرانی ہے۔ ایران میں بحیثیت مہمان کے ہمایوں نے بھی اپنے میزبانوں کو ایک دعوت میں مدعو کیا، جس کی خاص ڈش خشکہ اور پلاؤ تھا جسے دال کے ساتھ کھایا گیا۔ ایران والے یہ دونوں چیزیں انڈوں کے ساتھ جوڑ کر کے کھاتے تھے۔ شاہ ایران نے ایک موقع پر ہمایوں کی دعوت کی۔ اس کے لیے چھ سو شامیانے نصب کیے گئے اور دعوت کے دوران بارہ مقامات پر نقارے اور شادیانے بجائے گئے۔ استقبال کی مزید تفصیل بایزید کی کتاب تذکرہ یا تاریخِ ہمایوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(س۔ت ۱۰۰۰/۹۲-۱۵۹۱ء) میں ملتی ہے۔ اس کے مطابق طہماسپ نے خراسان کے حاکم کو یہ فرمان بھیجا تھا کہ ہر روز عمدہ قسم کے مشروبات اور حلوے تیار کر کے سفید روٹیوں کے ساتھ جو دودھ اور گھی میں گوندھی گئی ہوں اور جن میں سونف، خشخاش اور بہ دہ بیج ڈالے گئے ہوں جن سے روٹی لطیف اور مفید ہوتی ہے، آں حضرت (ہمایوں) کو بھیجے جائیں۔ مقربین و ملازمین کو یہ سب کچھ الگ سے بھیجا جائے۔ جہاں اس کا پڑاؤ ہو وہاں "مصفا، لطیف، منقش" خیمے، مخمل و اطلس کے سائبان، رکاب خانہ اور تمام" کارخانہ ہائے ضروری مہیا کیے جائیں اور جب وہ پڑاؤ پر اترے تو شربت میں عرق گلاب اور آب لیمو ملا کر، تاکہ خوش ذائقہ ہو، برف اور یخ سے ٹھنڈا کر کے پلایا جائے۔ شربت کے بعد مشہد و مشکان کے سیبوں کے مربے، انگور و تربوز میدے کی مذکورہ سفید روٹیوں کے ساتھ پیش کیے جائیں۔ تمام مشروبات کا معاینہ ضروری ہے جو حاکم خود کرے اور ان میں گل آب اور "عنبر اشہب" ڈالے تاکہ وہ خوشبودار اور لذیذ ہوں۔

حکمرانوں کی موت کی خبر کو اخفا میں رکھنے کا دستور بھی پرانا ہے (بابر کی بیٹی اور ہمایوں کی بہن گلبدن بیگم (م ۱۰۱۱ھ/۱۶۰۲ء) کے مطابق (ہمایوں نامہ) بابر کی موت کی خبر کو محض اس لیے پردۂ اخفا میں رکھا گیا کہ ملک میں کہیں فتنہ و فساد نہ سر اٹھالے اور طوائف الملوکی کا بازار گرم نہ ہو جائے۔ رعایا میں یہ مشہور کیا گیا کہ بابر نے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور زمام حکومت ہمایوں کے سپرد کر دی ہے۔

آج کے معاشرے کی بعض خواتین کبھی کبھی مردانہ لباس پتلون اور بش شرٹ پہن لیتی ہیں۔ بقول گلبدن بیگم مغل دور کی بعض شاہی خواتین مردانہ لباس پہنا کرتی تھیں، وہ مختلف مردانہ کھیلوں زہ گیری تراشی، چوگان بازی اور تیراندازی میں نہ صرف حصہ لیتی تھیں بلکہ وہ ان میں مہارت بھی پیدا کرتی تھیں۔ سیر و سیاحت اور شکار ایسے مشغلوں میں گھوڑوں پر سوار ہو کر حصہ لیتیں۔ گلبدن نے ان کے لکھنے پڑھنے کا تو ذکر کیا ہے لیکن یہ وضاحت نہیں کی کہ اس سے مراد ان کی عام تعلیم میں دلچسپی ہے یا وہ شعر و ادب میں دلچسپی لیتی تھیں۔

دور ہمایونی سے قبل برصغیر میں خوشی کے مواقع پر صرف بازاروں وغیرہ میں روشنی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی جاتی تھی۔ اب اس کا دائرہ وسیع تر ہوگیا، یعنی محلات کے علاوہ اب مکانوں اور مضافات کو بھی روشنیوں سے سجایا جانے لگا۔ گلبدن نے ایک مہم سے ہمایوں کی بخیریت واپسی پر ایسے ایک جشن کا ذکر کیا ہے۔ ماہم بیگم کے حکم پر خواص اور سپاہ نے بھی اس روشنی اور آرائش میں حصہ لیا۔ اسی دور میں "آیئن بندی" — یعنی شبستوں مثلاً جھاڑ اور فانوس وغیرہ سے گھروں بازاروں کو سجانے کا آغاز ہوا۔ عمومی خوشی پر آج کی طرح عورتیں اکٹھی مل کر گاتیں اور اکثر مرد بھی اس قسم کی محفلوں میں شریک ہوتے، لیکن اس کے لیے محرم ہونا ضروری تھا۔ نامحرم کو شرکت کی اجازت نہ تھی پردے کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ گلبدن نے اس دور میں عورتوں کے بعد احترام کا ذکر کرتے ہوئے بابر کی ایک مثال پیش کی ہے کہ ایک موقع پر وہ خود تو پیدل چلا لیکن بیوی کو اس نے سوار کیے رکھا، گلبدن نے پردے کی پابندی کے ساتھ ساتھ شادی بیاہ کے معاملے میں عورتوں کو پوری آزادی حاصل ہونے کی حیران کن بات بھی کی ہے۔

شیر شاہ سوری نے تھوڑا ہی عرصہ حکومت کی لیکن اس قلیل مدت میں عوام الناس کے آرام و آسائش اور خوش حالی کا جس قدر دھیان اس نے رکھا شاید ہی کسی اور حکمران نے رکھا ہو۔ ملا عبدالقادر بدایونی اس کا ذکر بڑے ادب کے ساتھ کرتا ہے شیر شاہ کو اس سے بڑا خراج تحسین اور کیا ہو سکتا ہے کہ بدایونی اس بات پر خدا کا شکر ادا کرتا ہے کہ اس کی پیدائش اس عادل بادشاہ کے زمانے (ماہ ربیع الثانی ۹۴۷ھ / اگست ۱۵۴۰ء) میں ہوئی۔ شیر شاہ کا زمانہ عدل و انصاف کا زمانہ ہے، بدایونی کا کہنا ہے کہ اس کے عدل و انصاف کی ایسی دھاک بیٹھی ہوئی تھی کہ اگر کوئی عورت بھی جنگل میں سونے کا تھال اچھالتی ہوئی چلی جائے تو کسی کی مجال نہ تھی کہ اسے ٹیڑھی نگاہ سے دیکھے۔ شیر شاہ کی تعمیر کردہ طویل ترین سڑک نے، جسے آج عرف عام میں جرنیلی سڑک یا گرینڈ ٹرنک روڈ کہا جاتا ہے، اس وقت کی تہذیب و معاشرت پر یقیناً ایک زبردست تعمیری اثر ڈالا، مختلف علاقوں کے لوگوں میں اس کی بدولت میل ملاپ بڑھا اور ان کے رہن سہن وغیرہ کے انداز نے ایک دوسرے کو متاثر کیا۔ بنگالہ سے رہتک تک پھیلی ہوئی اس سڑک پر، آگرہ سے مانڈو تک ہر کوس پر ایک سرائے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک مسجد اور ایک پختہ کنواں تعمیر کیا گیا، اور ہر مسجد میں سرکار کی طرف سے ایک امام اور ایک مؤذن بھی مقرر ہوا جو اس بات کی دلیل ہے کہ عوام مذہب کی طرف زیادہ مائل تھے، اس لیے حکمران کو ان کی اس ضرورت کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔ امام وغیرہ کی طرح ہر سرائے میں ایک ہندو سقہ بھی مقرر کیا گیا تاکہ ہندو رعایا کے افراد کو سفر میں ہر جگہ پانی میسر آسکے۔ مسافروں کے آرام کی خاطر اور اس خیال سے کہ وہ ٹھنڈی چھاؤں میں سفر کریں، اس سڑک پر دو رویہ درخت لگوائے گئے۔ یہ اسلامی تہذیب و ثقافت اور معاشرت کا ایک درخشندہ باب ہے۔

ابوالفضل کی آئینِ اکبری مغل دور کے برصغیر کے علمی، تہذیبی، ثقافتی، معاشرتی، ملکی، صنعتی، زراعتی، اقتصادی اور مذہبی حالات و واقعات کا ایک دلچسپ آئینہ ہے۔ اس میں امریکہ کی دریافت سے متعلق ایک عجیب واقعہ مرقوم ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ اس دور میں اسے خاصی شہرت حاصل تھی۔ ابوالفضل ارض بلد کے ذکر میں "ربع جنوبی" کے نزدیک ایک وسیع جزیرے کی بات کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ اس میں بہت سی عمارات ہیں۔ فرنگیوں نے اس علاقے پر قبضہ کر لیا اور اسے "عالم نو" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ہوا یوں کہ ایک تباہ شدہ کشتی اس طرف نکل گئی۔ وہاں کے لوگوں نے ایک سوار کو دیکھا جس کے پاس گھوڑا تھا، وہ گھوڑے کے ساتھ اس آدمی کو بھی جانور سمجھتے ہوئے بہت خوف زدہ ہوئے، جس کی وجہ سے فرنگیوں نے معمولی سی توجہ سے اس ملک پر قبضہ کر لیا۔

اس کتاب میں مشہور چرند، پرند اور درند کے علاوہ اس وقت موجود جانوروں وغیرہ کی تفصیلات بھی آگئی ہیں، جن میں سے چند ایک حیران کن قسم کے ہیں، مثلاً سفید اور زرد رنگ کی پردار بلی جو قدرے اڑتی بھی تھی۔ کتے سے چھوٹا جانور سارددل، شیر کو کھا لیتا تھا۔ ہارل، سبز رنگ کا پرندہ، سفید چونچ، سرخ آنکھ، کبوتر سے چھوٹا زمین پر نہیں بیٹھتا۔ جب پانی پینے کے لیے نیچے اترتا ہے تو لکڑی کا ٹکڑا پنجے میں لاتا ہے اور اسی حالت میں (ٹکڑا پنجے میں رکھ کر) پانی پیتا ہے۔ پپیہے کے بارے میں ابوالفضل کا کہنا ہے کہ اس سے عشقیہ قصے وابستہ ہیں۔ یہ بارش کے وقت زور زور سے الاپتا ہے۔ رات کے وقت اس کی دل سوز فغان زیادہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سنائی دیتی ہے۔ اس کی یہ فغاں عشق کے پرانے ناسور کو ایک نیا جنم دیتی ہے۔

خواجہ نظام الدین احمد کی طبقات اکبر شاہی (س ت ۱۰۰۱/ ۱۵۹۳) اور ملا بدایونی (م ۱۰۰۴ یا ۱۰۰۶ھ) کی منتخب التواریخ کے مطابق اکبر کو اس کی سال گرہ کے موقع پر سال میں دو مرتبہ (قمری اور شمسی تاریخ الگ الگ) سونے، چاندی اور تمام قسم کے اجناس میں تولا جاتا تھا۔ بعد میں یہ سب کچھ محتاجوں اور برہمنوں وغیرہ میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ بدایونی کے مطابق اکبر جمعہ کی نماز کے بعد "عبادت خانہ" میں مذہبی مجلسیں کراتا، ان میں اپنے وقت کے بڑے بڑے مشائخ و علما شرکت کرتے۔ مختلف دینی مسائل زیر بحث آتے، لیکن علما آپس میں مناظرہ شروع کر دیتے اور بات دور تک نکل جاتی۔ ان اختلافات وغیرہ کے باعث اکبر کی نظر میں علمائے اسلام کی وقعت کم ہو گئی اور وہ الحاد و بے دینی کی راہ پر چل نکلا۔

ہر دور میں جشنوں کا دور دورہ رہا ہے۔ گلشن ابراہیمی المعروف تاریخ فرشتہ میں بھی جشنوں کی بات تو ہوئی ہے لیکن اتنی تفصیل سے اجتناب ہے۔ ایک جگہ اتنا پتا چلتا ہے کہ والئ بیجاپور ابراہیم عادل شاہ کی بہن خدیجہ سلطان عرف راجا جیو کی شادی پر پہلے چار ماہ تک جشن منایا گیا، پھر رسم نکاح ادا ہوئی۔ آج بہت سی مجبوریوں کے تحت (ان میں ایک مجبوری فاصلے کی دوری بھی ہے اگرچہ آج فاصلے بہت سمٹ گئے ہیں) فون وغیرہ پر غائبانہ نکاح پڑھا جاتا ہے لیکن بعض حضرات اس سے اختلاف بھی کرتے ہیں جب ہم تاریخ کی ورق گردانی کرتے ہیں تو یہ چیز ہمیں صدیوں پہلے بھی نظر آتی ہے اور ظاہر ہے فون پر نکاح کی رسم قدیم کی رسم کے مقابلے میں کہیں زیادہ قرین حقیقت ہے، لیکن اُس زمانے میں اس رسم کے خلاف کوئی فتوئی وغیرہ دکھائی نہیں دیتا۔ ابراہیم عادل شاہ کی شادی حیدرآباد کے محمد قلی قطب شاہ کی بہن چاند سلطان عرف ملکۂ جہاں سے طے پاتی ہے۔ اوّل الذکر اپنے خاص آدمی بہت زیادہ نقد و جنس کے ساتھ بھیجتا ہے اور یوں وہاں غائبانہ نکاح پڑھایا جاتا ہے، گویا بارات حاضر دولہا غائب۔ یہ شادی ۹۹۶ھ (۱۵۸۸ء) میں انجام پائی۔ جہیز جو دلہن کو دیا گیا بہت سی حسین و جمیل کنیزوں، نادر اور قیمتی جواہرات کے صندوقچوں، زرکش لباسوں، سو اونٹوں پر لدی ہوئی فرنگی اجناس، روسی کتان کے کئی ڈھیروں، بہترین مشک و عنبر اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

متعدد خیمہ و خرگاہ پر مشتمل تھا۔

قدیم دور میں گھوڑے کو بہت اہمیت رہی ہے۔ جنگ کے زمانے میں ایک سوار جنگجو کے لیے گھوڑا ناگزیر تھا تو امن کے زمانے میں شاہی جلوس اور دیگر امور کے لیے اس سے کام لیا گیا۔ اس کی اسی اہمیت کے سبب اس کی پرورش و تربیت کی طرف خاص توجہ ہوئی۔ تاریخ سندھ یا تاریخ معصومی (۱۰۰۹/۱۶۰۰-۱) کے مؤلف نے ارکان کے علاقے (جو سیوی، بھکر اور سیت پور کے درمیان واقع تھا) کا ذکر کرتے ہوئے وہاں کے گھوڑے کو عراقی گھوڑے کی ٹکر کا کہا ہے اور یہ عجیب بات بتائی ہے کہ جب بچھیرا پیدا ہوتا ہے تو اس خاطر سے کہ اسے بعد میں نعل لگوانے کی ضرورت نہ رہے اس کے اردگرد سنگریزے بچھا دیتے ہیں جن پر وہ کوئی ایک برس تک چلتا پھرتا ہے اس سے اس کے سُم پتھر کی مانند سخت ہو جاتے ہیں اور یوں آگے چل کر وہ نعل کی زحمت سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ اگرچہ اب گھوڑوں کی وہ اہمیت نہیں رہی اور ان کی تعداد بھی آہستہ آہستہ کم ہو رہی ہے تاہم آج بھی اس طریقے پر عمل ہو سکتا ہے۔

بعض سلاطین گجرات (کاٹھیاواڑ) کی پرہیزگاری اور مذہب دوستی کے قصے اس دور کی مقامی تاریخوں میں ثبت ہیں، ان میں سے ایک مشہور واقعہ تو سلطان مظفر گجراتی کا ہے جسے علامہ اقبال نے جاوید نامہ میں منظوم کیا ہے اور وہ یہ کہ اس کا ایک نہایت قیمتی اور پسندیدہ گھوڑا بیمار ہو گیا۔ بیطار نے علاج میں شراب تجویز کی، جس سے وہ تو ٹھیک ہو گیا لیکن سلطان نے پھر کبھی اس پر سواری نہ کی۔ تاریخ گجرات مؤلف ابوتراب ولی شیرازی (م ۱۰۰۳/ ۱۵۹۵) نے وہاں کے سلاطین کے بارے میں لکھا ہے (اور اس قسم کی باتیں مرآۃ سکندری، سال تصنیف ۱۰۲۰ھ ۱۶۱۱ء کے مؤلف سکندر محمد نے بھی لکھی ہیں) کہ ربیع الاول کے پہلے بارہ دن (بمناسبت ولادت مبارکہ حضور اکرمؐ) وہ ختم قرآن کریم کراتے جس میں علما صلحا اور اصحاب حدیث کے علاوہ اشراف و اکابر بھی شرکت کرتے۔ ختم کے بعد قہوہ پھل اور خوشبوئیات نیز طرح طرح کے کھانے شرکا میں تقسیم کیے جاتے۔ بارھویں روز کھانے کے بعد خلعتوں کے ساتھ ساتھ نفیس کپڑے اور سونے کی تھیلیاں خوان میں رکھ کر ہر شریک مجلس کو اس کے حسب مرتبہ سو اشرفی اور سو پارچہ سے لے کر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بارہ اشرفی سے بارہ پارچہ تک پیش کی جاتیں۔ ان کے علاوہ ضرورت مندوں وغیرہ کو بھی اچھا کھانا، ایک اشرفی اور ایک جوڑا لباس دیا جاتا۔ ربیع الاول کی بارھویں تاریخ کو سلطان بڑے حسن عقیدت و ادب کے ساتھ پانی کا ایک لوٹا ہاتھ میں تھامے مجلس میں شریک بارہ بڑے آدمیوں کے ہاتھ پر پانی گراتا جسے تبرک کی حیثیت حاصل تھی۔ مرآۃ سکندری کے مطابق محمود ثانی ان بارہ دنوں میں اپنے دربار اور محل میں مشائخ و علما کو مدعو کرتا، جہاں بخاری شریف کا درس ہوتا۔ بارہ تاریخ کو وہ خود ان لوگوں کی خدمت کرتا اور ان کے ہاتھوں پر پانی ڈالتا اور وزرا طشت پکڑے رہتے۔ یہ سلاطین کوئی شہر آباد کرتے تو اس کی بنیاد اپنے علاوہ صوفیا وغیرہ سے بھی رکھواتے چنانچہ جب سلطان احمد نے آباد کی بنا ڈالی۔ آغاز ۸۱۳ھ۔ اختتام ۸۱۶/۱۴۱۱، ۱۴۱۴ تو قطب المشائخ شیخ احمد کھٹو اور ملا احمد وغیرہم نے بنیاد رکھنے میں حصہ لیا

تعمیر عمارات کی طرف حکمرانوں کی خاص توجہ رہی ہے اور اس میں انھوں نے اپنے نفیس ذوق کے اظہار میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ فرشتہ نے عادل شاہ کے دور میں اس کی "عمارت دوستی" کا ذکر کیا ہے۔ اس کے مطابق اس (عادل شاہ) نے محل کے ایک دروازے کے اوپر "نورس بہشت" نام کی ایک آٹھ پہلو عمارت بنوائی تھی محل کی دیواریں اندر اور باہر سے مطلا کی گئی تھیں۔ ماہر نقاشوں نے ان دیواروں پر اس قدر دل کش تصاویر نقش کی تھیں کہ دیکھنے والا ایک مرتبہ تو محو حیرت ہو جاتا تھا۔ عمارت کے اوپر ایک عمارت کی بلندی اس حد تک تھی کہ اس سے پورا بیجاپور نظر آتا تھا۔ یہ محل ۱۰۱۰ھ/۱۶۰۱ء میں تکمیل پذیر ہوا۔ تکمیل پر ایک جشن منایا گیا۔

مسلمانوں میں حق گو اور نڈر علما کی کبھی کمی نہیں رہی۔ یہی وہ لوگ ہیں جو صرف ایک اللہ سے ڈرنے کے سبب کسی مستبد سے مستبد حاکم کے آگے گردن جھکانے کو تیار نہ ہوئے۔ فرشتہ کے بقول سلطان محمود خلجی رزق حلال سے اپنے طعام و لباس کا سامان کیا کرتا تھا۔ جب کبھی وہ سفر پہ جاتا تو جائز اور حلال کمائی سے خریدی ہوئی گندم، چاول، گھی اور لباس وغیرہ ساتھ لے کر چلتا۔ اس ضمن میں اس کا ایک انوکھا طریقہ یہ تھا کہ تختوں پہ کاشت کی ہوئی سبزی ہمراہ رکھتا تاکہ ضرورت کے مطابق توڑ کر استعمال کی جا سکے۔ یہ تو تھا اس کی زندگی کا روشن پہلو لیکن ایک تاریک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پہونچی تھا، وہ اس طرح کہ اس نے احمد آباد بیدر کا محاصرہ کیا۔ اسے فتح کرنے کے بعد وہاں کی عمارتوں کو جلا دیا اور لوگوں کو لوٹ کر ان کو بُرے حالوں پہنچا دیا۔ بعد میں رعایا کی دلجوئی اور ملک کی آبادی کے لیے وہاں کچھ دیر ٹھہر گیا۔ اس طویل قیام کے باعث سبزیوں میں کمی واقع ہوتی گئی۔ ایک روز اس نے مولانا شمس الدین حق گو، کو بلوا کر جو شاہ خلیل اللہ کے مقبرے میں مقیم تھے، اس کمی پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں کسی ایسے شخص کا پتا دیں جو زمین حلال رکھتا ہو اور اس میں سبزی کاشت کرتا ہو تاکہ اس سے اچھی قیمت پر رزق حلال سے سبزی خرید کر مطبخ تک پہنچائی جایا کرے۔ مولانا حق گو (یہ ان کا غالباً لقب تھا اور شاید ان کی حق گوئی ہی کی بنا پر انھیں یہ لقب دیا گیا تھا) جواب میں بولے: اے سلطان! ایسی بات نہ کر جو ہنسی ٹھٹھے اور استہزا کا باعث بنے، اس لیے کہ ایک طرف تو مسلمانوں کے ملک میں داخل ہو کر ان کے گھر بار اور مساکن ویران کرتا اور ان کا مال و اسباب لوٹتا ہے اور دوسری طرف سبزی اور اشیائے خوردنی و پوشیدنی کے لیے خود کو شرع کا پابند ثابت کرتا ہے۔ یہ بات عقل سے دور اور خدا ترسی سے بعید ہے۔ سلطان نے آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے ان کی اس بات کو تو صحیح قرار دیا لیکن ساتھ ہی اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے یہ دلیل بھی دی کہ جہاں گیری اس کے بغیر ممکن نہیں۔ معلوم نہیں اس کے پیش نظر کون سی جہاں گیری تھی؟ کیوں کہ اسلامی جہانگیری تو بنیادی طور پر تسخیر قلوب کی قایل ہے۔ اگر اس کی یہ بنیاد نہ ہوتی تو اسلام کی اشاعت اسی زمانے میں رک گئی ہوتی۔ بہر حال اقتدار کی کرسی سے چمٹے رہنے کے لیے ہر دور میں حالات اور رواج کے مطابق "حیلہ ہائے پرویزی" سے کام لیا گیا ہے۔

عمارات کی تعمیر اور پھولوں پھلوں سے ارباب اقتدار کی دلچسپی کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے، اب مآثر رحیمی ۱۰۲۵/۱۶۱۶ کے مؤلف کی زبانی بھی عبدالرحیم خان خاناں کی ان سے دلچسپی و شیفتگی کے بارے میں سنیے۔ اس کے حکم پر بہت سے مدرسے، مساجد اور حمام تعمیر ہوئے۔ برہان پور میں "دل کشا" کے نام سے ایک عظیم الشان قصر بنایا گیا، علاوہ ازیں حمام، نہر اور جامع مسجد کی تعمیر بھی ہوئی۔ لاہور، دہلی، احمد آباد اور سورت میں خان خاناں کی بنوائی ہوئی عمارات، باغات، تالاب اور سرائے کی تفصیل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کتاب میں ملتی ہے۔ اس نے جہانگیر کے نام پر ایک شہر جہانگیر پورہ بھی آباد کیا جس میں دل کشا منازل، بڑی شان دار، فرح افزا عمارات اور سرائیں تعمیر کرائی گئیں۔ ان سے ہٹ کر میدان اور بازار (مارکیٹیں) بھی یہاں بنائے گئے۔ باہر سے بڑے بڑے ماہر باغبان منگوا کر خاندیش میں ایک باغ بنوایا جس میں برصغیر کے مختلف علاقوں کے علاوہ عراق و خراسان سے پھولوں اور پھلوں کے پودے لا کر لگائے گئے۔ برہان پور کے لوگ خربوزے کے نام اور لذت سے نا آشنا تھے۔ خان خاناں کی بدولت اس پھل تک ان کی رسائی ہوئی۔ عراق اور خراسان سے اس کے بیج منگوا کر بلکوارہ کے قصبے میں کاشت کیے گئے۔ (یہ غالباً اس علاقے کی آب و ہوا کا اثر تھا کہ) دو سال ہی کے عرصے میں یہاں کا خربوزہ اپنی شیرینی و کثرت کے لحاظ سے ایران کے خربوزوں کو ماند کر گیا۔

پھلوں اور پھولوں کے سلسلے میں تزک جہانگیری مصنفہ نورالدین جہانگیر (م ۱۰۳۷ھ / ۱۶۲۸ء) کے بھی بعض صفحات کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ اس نے ترکستان اور بعض دوسرے علاقوں سے ایسے پھلوں کے پودے منگوائے جو برصغیر میں کاشت نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ اس کے پہلے ہی سال جلوس میں جو انگور لاہور میں بکثرت دستیاب تھے، ان میں حبشی، کشمش اور صاحبی نام کے انگور خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس نے اناس کا پودا یورپ کے ساحلی علاقوں سے منگوایا اور اسے آگرہ کے باغ "گل افشاں" میں لگایا۔ جہانگیر نے بہت سے پھولوں، ان کی خوشبو اور لطافت کے علاوہ یہاں کے درختوں کے نام گنوائے ہیں۔ پھر مختلف جانوروں اور حیوانوں کے عادات و خصائل کی تفصیل دی ہے جو نہایت دلچسپ ہے۔ اس نے بعض جانوروں کے بارے میں مشہور باتوں کی تصدیق کے لیے خود تجربے کیے جن کی وجہ سے بہت سی ایسی باتیں غلط ثابت ہوئیں۔ مثلاً یہ کہ ایک وقت میں پہاڑی مینڈھے (نر) کے سینگ میں کیڑے پیدا ہونے سے وہ یا تو درختوں اور پتھروں پر سینگ رگڑ کر خارش دور کرنے کی کوشش کرتا ہے پھر دو مینڈھے آپس میں لڑتے ہیں۔ جہانگیر نے تصدیق کی تو مادہ کے سینگ میں بھی کیڑے نکلے۔ یہ بات کہ گوبر سے بچھو پیدا ہوتا ہے، اس کے تجربے سے غلط ثابت ہوئی۔ مشہور کپڑے کتان کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ چاندنی میں پھٹ جاتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس نے کتان چاندنی میں رکھ کر دیکھا، ایسی کوئی بات نہ ہوئی۔ شیر کی بہادری کا سبب جاننے کے لیے اس نے ایک شیر ذبح کیا۔ عام حیوانوں کا پتّا جس طرف ہوتا ہے شیر کا پتّا اس کے برعکس نکلا۔ اس کے خیال میں ممکن ہے یہی بات اس کی بہادری کا باعث ہو۔ مارخور بکرے اور بربری بکری کے ملاپ سے اس نے ایک نئی نسل بکریوں کی حاصل کی، جو اس کے مطابق اصیل بکری سے کہیں زیادہ اصیل تھی، اس نے یہ نسل عام کرنے کی کوشش کی تاکہ اس قسم کے بکرے بکریاں لوگوں کو بھی حاصل ہو سکیں۔ نسل کشی کے نتیجے میں جو میمنے پیدا ہوئے ان سب کے اس نے نام رکھے۔

برصغیر میں بچوں کو شاہی دربار میں ملازمت دلانے کی خاطر خصی کر کے حکام کے پاس فروخت کرنے کا رواج تھا۔ بالخصوص سلہٹ کے اکثر لوگ اپنے بچوں کے ساتھ ایسا کرتے تھے، اس ظالمانہ فعل کو جہانگیر نے سختی سے بند کر دیا۔ صوبہ بہار کے بعض کارکنوں نے اس حکم کی خلاف ورزی کی جس پر جہانگیر نے انھیں عمر قید کی سزا دے کر جیل میں ڈال دیا۔ اس نے کھلے بندوں بکنے والی شراب اور بھنگ کے سب اڈے بند کروا دیے کہ ان سے بازاروں میں فتنہ و فساد برپا رہتا تھا۔ تزک جہانگیری کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ اس نے اس قسم کی بہت سی معاشرتی برائیوں کے استیصال کے علاوہ عدل و انصاف کی طرف خاص توجہ دی۔ یہ اس کا خاص کارنامہ ہے جو کسی اور عہد میں نظر نہیں آتا۔ اس سلسلے میں اس کی زنجیر عدل کو بڑی اہمیت حاصل ہے جو آگرہ کے قلعہ میں نصب کی گئی۔ یہ خالص سونے کی تھی اور اس کی لمبائی تیس گز تھی۔ اس میں ساٹھ گھنٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ اس کا ایک سرا شاہ برج کی چوٹی کے ساتھ اور دوسرا سرا جمنا دریا کے کنارے سنگ میل کے ساتھ باندھا گیا تھا۔ یہ کام اس نے تخت نشین ہوتے ہی انجام دیا۔

سائنسی اور تکنیکی آلات وغیرہ کی عدم موجودگی کے باوصف مسلمانوں نے مختلف شعبوں میں کس قدر مہارت و دسترس بہم پہنچا رکھی تھی۔ اس کی ایک مثال حکیم علی کا وہ حوض ہے جس کی کسی قدر تفصیل تزک جہانگیری میں ملتی ہے۔ یہ حوض چھ × چھ گز کا تھا۔ اس کے ایک پہلو میں ایک نہایت روشن حجرہ تھا۔ اس میں داخل ہونے کے لیے حوض کے پانی میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ اس کا دروازہ اگرچہ حوض کے پانی سے متصل تھا لیکن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پھر بھی اس میں پانی داخل نہیں ہو سکتا تھا اور اس میں دس بارہ آدمی آرام کے ساتھ بیٹھ کر گفتگو کر سکتے تھے۔ جہانگیر اپنے چند ایک مصاحبوں کے ساتھ اس حجرے میں داخل ہوا اور کچھ دیر ٹھہر کر باہر آیا تھا۔ اقبال نامۂ جہانگیری کے مؤلف نے اس حوض کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ حکیم علی نے ایسا ہی ایک حوض اکبر کے زمانے میں لاہور میں بنایا تھا، جس کا ذکر ملا عبدالقادر بدایونی کی منتخب التواریخ میں بھی ملتا ہے۔ بدایونی کے مطابق یہ حوض نامکمل تھا، اسے اکبر نے زر سیاہ سے بھروایا جس کی قیمت بیس کروڑ روپیہ بنی۔ اس حوض پر منعقد ہونے والی محفل موسیقی کے ذکر میں بدایونی نے یہ عجیب بات بھی لکھی ہے جو آج کے لوگوں کے لیے حیرانی کا باعث ہو گی کہ تان سین بے سرا تھا جب کہ ہم اسے موسیقی کا بابا آدم قرار دیتے ہیں۔ بدایونی لکھتا ہے: محفل میں میاں تان سین اور دوسرے بہت سے بے سرے گویے بھی بلائے گئے تھے۔ بادشاہ نے شیخ بنجھو (بیجو؟) کو ان سب پہ ترجیح دی۔

جشنِ نوروز بعد میں مسلمان حکمران بھی، جن میں برصغیر کے حکمران شامل ہیں (بجز اورنگ زیب کے) بڑی شان سے مناتے رہے ہیں۔ آج کل اس کا آغاز ۲۱ مارچ سے ہوتا ہے۔ یہ دن ایرانی شمسی سال کا پہلا دن ہے۔ اس روز دوپہر کو عین تحویل سال کے وقت (جس کا پہلے اعلان کر دیا جاتا ہے) ایرانی گھڑیاں لے کر بیٹھ جاتے ہیں، جیسے ہی سوئی اس وقت پر پہنچتی ہے ایرانی اٹھ کر ناچنا گانا شروع کر دیتے ہیں اور پھر باقاعدہ تہوار شروع ہو جاتا ہے جس میں آگے کئی رسوم چلتی ہیں۔ بہرحال مسلمان حکمرانوں نے مبالغے کی حد تک اس جشن کو منایا۔ ہر دور کی کتب تواریخ میں اس جشن کا بیان تفصیل سے ملتا ہے۔ تُوزکِ جہانگیری میں جہانگیر لکھتا ہے کہ منگل ۱۱، ماہ ذی قعدہ ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۶ء کو رات گزرنے پر سورج بُرج حوت سے اپنے خانۂ شرف و خوش حالی یعنی بُرج حمل میں منتقل ہوا۔ چوں کہ تخت نشینی کے بعد یہ پہلا جشنِ نوروز تھا اس لیے میرے حکم سے دولت خانہ خاص و عام کے ایوانوں کو والد بزرگوار کے زمانے کے دستور کے مطابق انواع و اقسام کے سامان آرائش سے نہایت شان و شوکت کے ساتھ سجایا گیا۔ اس کے مطابق رعایا نے یہ جشن ۱۹ روز تک منایا۔ موسیقی و رقص کی محفلیں دربار میں جمیں۔ اس نے اکبر کے زمانے میں بھی منائے جانے والے اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جشن کی کسی قدر تفصیل دی ہے۔ اس کے مطابق اس جشن کے سترہ اٹھارہ روز میں ہر روز ایک امیر مجلس آراستہ کرتا، اکبر کو دعوت دیتا اور نایاب قیمتی اشیا مثلاً جواہرات مرصع آلات جنگ اور ہاتھی گھوڑے وغیرہ اس کی نذر کرتا۔ اکبر ان امرا کی قدر افزائی کے لیے ان مجالس میں جاتا، تحفے ملاحظہ کرتا اور جو کچھ پسند آجاتا قبول کر لیتا، باقی چیزیں انھیں ہی بخش دیتا۔

جہاں گیر علما اور طلبا کی قدر افزائی کرتا تھا۔ چنانچہ ۱۰۱۶ھ/۱۶۰۷ء میں جب وہ کابل میں تھا تو راتوں کو اکثر اس کی ان کے ساتھ مجلسیں رہتیں۔ اس نے وہاں کی رعایا کی سہولت کی خاطر بعض محصولات کے علاوہ زکوٰۃ کی وصولی بھی معاف کر دی اور یہ معافی باقاعدہ ایک گز طویل اور پون گز چوڑے پتھر پر ان الفاظ میں کندہ کی گئی کہ میں نے کابل سے زکوٰۃ کی وصولی اور باقی محصولوں کو معاف کر دیا اور میری اولاد اور جانشینوں میں سے جو کوئی اس کی خلاف ورزی کرے اللہ تعالیٰ کے قہر و غضب کا ... نشانہ ہو۔

اقبال نامہ جہانگیری میں اہل کشمیر کے رہن سہن اور کاروباری طریقوں کی دلچسپ تفصیل ملتی ہے۔ یہ لوگ سکے کی بجائے جنس سے خرید و فروخت کرتے تھے۔ ان کی رہائش لکڑی کے تین تین چار چار منزلہ مکانوں پر ہوتی جن کی چھتوں پر مٹی ڈال کر موسم بہار میں لالہ کے اور دوسرے پھول اگاتے جو کھلنے پر انتہائی حسین و دل کش منظر پیش کرتے۔ کشمیری گرم کھانا کھانے کے عادی نہ تھے۔ غریب لوگ کھانے کا کچھ حصہ رات کو رکھ چھوڑتے اور دوسرے دن صبح کے وقت کھاتے۔ چاول ان کی من پسند خوراک تھی جو پکنے پر بھت یا بھتا کہلاتی۔ (آج بھی پاکستان کے بیشتر کشمیری چاول کے بہت رسیا ہیں۔ یہ لوگ اب بھی رات کو چاول بچا کر رکھتے اور صبح اٹھ کر کھاتے ہیں، پکے ہوئے چاولوں کو وہ بتا کہتے ہیں) کشمیری گھی کا استعمال کم کرتے، سبزی پانی میں ابال کر اس میں ذرا سا نمک ڈال لیتے۔ محمد شریف بن دوست محمد، مخاطب بہ معتمد خان مؤلف اقبال نامہ جہانگیری کے مطابق کشمیریوں کا زیادہ تر لباس پشمینہ تھا اور عام کشمیری عورتیں ایک ایک کرتا بغیر دھونے کے کئی برس تک پہنتیں۔

اکبر نے بعض دوسری بدعتوں کے علاوہ "سجدۂ تعظیم" کی بدعت بھی شروع کی تھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو محمد صالح کمبوہ مؤلف عمل صالح (متوفی ۱۰۷۵ھ یا ۱۰۸۵ھ/۱۶۶۴ء یا ۱۶۷۴ء کے مطابق شاہجہان نے تخت نشین ہوتے ہی، اپنی پرہیزگاری کے باعث، ایک فرمان کے ذریعے ختم کردی، شاہجہان نے بقول مؤلف، ارکان اسلام کی ترویج پر بہت زور دیا۔ اس سلسلے میں اس نے صوبہ سرحد میں بایزید کے مریدوں اور پیروکاروں کا استیصال کیا، یہ لوگ بہت سی غیر شرعی حرکتوں اور بدعتوں کے مرتکب ہو رہے تھے۔ ان کے نزدیک کسی عورت کو بغیر نکاح کے بھی پاس رکھا جاسکتا تھا۔ وہ ایک خاص محفل برپا کرتے جس میں دعوت کے بعد حاضرین کسی ایجاب و قبول کے بغیر عورتوں کو اپنے تصرف میں لے آتے۔ جب کسی کے یہاں کوئی لڑکا پیدا ہوتا تو گدھے کے کان کا خون اس کے حلق میں ٹپکاتے۔ بیوی کو اس کے مردہ شوہر کی جائداد وغیرہ سے محروم قرار دیتے) علاءالدین خلجی اور فیروز شاہ تغلق کے ادوار میں بھی اس قسم کے لوگ موجود تھے)

محمد صالح کنبوہ نے اپنی کتاب میں شاہجہانی دور میں مغلیہ سلطنت کی وسعت اور مختلف اخراجات کی بھی کچھ تفصیل دی ہے۔ اس کے مطابق یہ سلطنت بندرگاہ لاہری سے سلہٹ تک پھیلی ہوئی تھی جس کا طول دو ہزار کوس شاہی بنتا ہے۔ یہ کوس پانچ ہزار گز اور ہر گز بیالیس انگشت پر مشتمل تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ تاج محل پر پچاس لاکھ روپیہ صرف کیا گیا۔ تیس برسوں میں نو کروڑ ساٹھ لاکھ روپیہ نقد و جنس انعام میں تقسیم کیا، اور اڑھائی کروڑ روپیہ مساجد، قلعوں، باغات اور دولت خانوں ایسی عمارات پر اٹھایا۔ حضور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم سے شاہجہان کی انتہائی عقیدت کا پتا اس امر سے چلتا ہے کہ اس نے تحفے کی صورت میں ملنے والے ایک قیمتی الماس (قیمت اڑھائی لاکھ روپیہ) کو ایک مرصع قندیل میں جڑوایا اور اس قندیل کو جس کا نام "گلِ محمدی" رکھا گیا، حضور اکرمؐ کے روضۂ اکرم پر بھجوادیا۔ صرف اس قندیل پر اس وقت ساڑھے تین لاکھ روپے صرف ہوئے۔

مؤلف عمل صالح نے کشمیر کے ذکر میں ایک جگہ لکھا ہے کہ اس علاقے کی بنا کا آغاز حضرت (ابراہیم) خلیل اللہ علیہ السلام کے زمانے میں ہوا اور بعض کے نزدیک حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد میں ان کا انتہائی تیز رفتار "براق" دو ماہ کا راستہ طے کرکے اس سرزمین پر اترا تھا اور یہ جگہ حضرت سلیمانؑ کو بہت پسند آئی تھی۔ پھر ان کے حکم سے دیووں نے بارہ مولا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی سمت سے پہاڑ کاٹ کر اس علاقے میں پانی کی فراوانی کر دی۔ اس روز سے یہ خطہ رفتہ رفتہ لوگوں سے آباد ہوتا چلا گیا۔

عالمگیر کے زمانے میں یہ عجیب شاہی دستور تھا کہ بقول منشی محمد کاظم مؤلف عالم گیر نامہ (سال تصنیف ۱۰۷۸/۱۶۶۸) جب کوئی شہزادہ اپنے باپ یا دادا سے ملنے جاتا تو سب سے پہلے کوئی چیز یا روپیہ نذر کی صورت میں اس بزرگ کو پیش کرتا۔ چنانچہ ایک موقع پر جب عالمگیر کا بیٹا شہزادہ محمد اعظم اپنے دادا (شاہجہان) سے ملاقات کے لیے گیا تو اس نے دادا کو پانچ سو مہروں اور چار ہزار روپیہ کی نذر گزرانی اس دور میں عید کی طرف خاص توجہ ہوتی۔ اس موقع پر ایوان ہائے خاص و عام کو بہت زیادہ آراستہ کیا جاتا، یہاں تک کہ مؤلف کے مطابق وہ عظمت اور شان و شوکت کے لحاظ سے چرخ بریں اور نگار خانہ چین کو مات کر جاتے۔ عالمگیر اس روز مسجد میں جا کر باجماعت نماز ادا کرتا اور واپس آ کر انعام و اکرام سے لوگوں کو نوازتا۔

عوام کی سہولتوں کی خاطر یہاں ہر دور میں مختلف قسم کی عمارات کی تعمیر کی طرف ارباب حکومت کی توجہ رہی ہے۔ عالم گیر نے اس طرف خاص اعتنا کی۔ اس نے سرکار خالصہ شریف کی آمدنی سے بہت سے بازار، مساجد، پختہ کنوئیں اور حمام بنوائے۔ یہ سب عمارتیں چونے، گچ اور اینٹ اور پتھر سے تعمیر کردہ سراؤں میں بنائی گئیں لوگوں کے آرام اور سہولت کی خاطر جہاں اس نے پرانی سراؤں کی مرمت کروائی وہاں ہر منزل پر ایک منزل گاہ تعمیر کی۔ پلوں کی تعمیر کی طرف بھی توجہ کی۔ اس نے مساجد میں باقاعدہ امام اور مؤذن مقرر کیے۔ عالمگیر کو تعلیم کی توسیع کا خاص خیال تھا اس نے ہر قصبہ اور شہر میں مکتب اور مدرسے قائم کیے۔ وہ ایسے طالب علموں کی حوصلہ افزائی نقد و جنس اور وظیفوں کی صورت میں کرتا جو لیاقت اور استعداد کے مالک ہوتے، یہ وظیفے وغیرہ ان طلبا کے حسب اہلیت و لیاقت ہوتے۔

بعض غیر مسلم مؤرخین نے ایک خاص مقصد کے تحت عالمگیر پر متعصب مسلمان ہونے کا الزام لگایا ہے، لیکن معاصر تواریخ اس الزام کی تردید کرتی ہیں۔ یہ تردید محض لفظی نہیں بلکہ حقائق و شواہد کے ساتھ پیش ہوئی ہے۔ اگر وہ متعصب ہوتا تو اس کے دربار اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لشکر میں ایک بھی ہندو عہدیدار نہ ہوتا۔ یہ موضوع تفصیل طلب ہے، بہر حال عالمگیر نامہ کے مطابق عالمگیر نہ صرف اپنے ہندو عہدیداروں سے بہت اچھا سلوک کرتا تھا، بلکہ ہندو راجوں مہاراجوں سے بھی حسن سلوک سے پیش آتا اور انھیں موقع بموقع بڑے بڑے قیمتی تحائف ــــ طرۂ مرصع، مروارید کی لڑیاں اور خلعت فاخرہ ــــ سے نوازتا رہتا۔ صاحبِ مآثر عالمگیری (۱۱۲۲/۱۷۱۰) نے اس کی عبادت گزاری اور شب بیداری اور مذہب سے لگن کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ وہ جنگ میں بھی نماز سے غافل نہ رہتا تھا۔ چھوٹی سے چھوٹی بدعت بھی اسے ناپسند تھی۔

عالمگیر کی بیوی جہاں زیب بانو بیگم کی دائیں چھاتی پر ایک موذی دانہ نکلتا ہے۔ وہ دو سال صاحبِ فراش رہ کر وفات پا جاتی ہے۔ بیماری کے دوران میں ایک انگریز ڈاکٹر موسی مارٹین کی ایک رشتہ دار لیڈی ڈاکٹر کو بلوایا جاتا ہے تاکہ وہ بیگم کو دیکھ کر ساری صورت حال مارٹین کو بتائے کہ اس طرح علاج آسان ہوگا۔ بیگم اپنی کوکہ سے اس عورت کی عمر اور شراب نوشی کے بارے میں تحقیق کرنے کو کہتی ہے۔ پتا چلتا ہے کہ وہ شراب پیتی ہے۔ بیگم کہتی ہے کہ اگرچہ یہ تکلیف مہلک ہے لیکن میں نہیں چاہتی کہ کوئی فاسقہ میرے جسم کو ہاتھ لگائے۔

© rasailojaraid.com